قدیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں

(جناب مولوی محمد عبدالسلام صاحب رام پوری)

اسلام زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کو چند سادے اور بنیادی عقیدوں کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کے سخت ہی ان کی قدریں متعین کرتا ہے۔ مسلمان طرح طرح کے ظروف و حالات سے دو چار ہوتے رہے کہیں ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی تو کہیں ہم آہنگ بنانے کی تاہم ان کا انداز فکر ہر جگہ، ہر زمانے میں اور ہر حال میں یکساں اور منفرد رہا۔ اس طرح ان میں ایسی ملیت کی بنیاد پڑ گئی جو زمان و مکان اور نسل و قوم کے تعصبات سے پاک تھی، مسلمانوں نے اپنی اس ملی انفرادیت کو قایم رکھنے کے لئے جو شعوری یا غیر شعوری کوششیں کی ہیں ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں پھر بھی ان کی اس کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے ہر قسم کے اداروں کو اپنی انفرادیت کا مظہر بنا کر ہی چھوڑا۔ زندگی کے جائز اور ضروری تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کو اپنے رنگ میں پورا کرنے کی کوشش کی اس طرح ماحول سے بے آہنگ بھی نہ ہوئے اور ملی انفرادیت بھی قایم رہی، انھوں نے دوسروں کو جذب کیا لیکن خود کسی میں جذب نہ ہوئے، مسلمانوں کا یہ ملی شعور ان کے تمام اداروں پر برابر چھایا رہا۔

امت اسلامیہ کا ادارۂ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے اہم مظہر رہا ہے۔ یہ ادارہ اگر ایک طرف اس کے مذہبی تصورات اور عقاید سے سب سے زیادہ متاثر تھا تو دوسری طرف اس کی قومی تشکیل میں سب سے بڑی انداز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارے کا مقصد افراد کو ان کے ذوق و استعداد کے مطابق زندگی کی گوناگوں وسعتوں کے لئے تیار کرنا اور ترقی پذیر گرد و پیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی استعداد پیدا کرنا

تھا۔ مسلمانوں کی درسگاہیں ہر قسم کے علوم وفنون کا مرکز رہیں۔ علوم میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہ تھا۔ یہ درسگاہیں حکومت کے ساتھ اور حکومت کے بغیر دونوں طرح چلتی رہیں اور اس طرح مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ مسلمانوں کی ملّی زندگی کے جزؤ لاینفک کی حیثیت میں قایم اور برقرار رہا۔

چونکہ مسلمانوں کی ملّی زندگی اور اس ادارے کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے جوں جوں ان کی ملّی حیات میں جمود و اضمحلال آتا گیا ان کا ادارۂ تعلیم بھی ویسے ویسے جامد اور مضمحل ہوتا گیا۔ اگر ملوکیت کی پیش قدمیوں، بس پائیوں اور آبادکاریوں اور تباہ کاریوں کی داستان کو ہی مسلمانوں کی مکمل داستان نہ سمجھ لیا جائے تو درحقیقت چوتھی یا پانچویں صدی سے ہی تاریخ کی اس بڑی اور اثر انداز ملت میں جمود اور اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور وہ ہر جہتی اور مناسب نمو اور ارتقا جو کسی قوم کو ہر طرح کے گرد و پیش میں ترقی پذیر اور متناسب بناتے رکھتا ہے اس کے دھارے خشک ہونا شروع ہو گئے تھے

یہ جمود و اضمحلال کیسے آیا اور کیوں کر آیا اس کی داستان طویل ہے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے تلخ بھی لیکن حقیقتوں سے صرف نظر بھی کب تک۔ مسلمانوں کا مذہبی اور علمی تنزل بلکہ میرے نزدیک تو ان کا سیاسی اور اقتصادی زوال بھی اسی داستان کا المناک باب ہے میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا تاہم کچھ اشارے بے محل نہ ہوں گے۔

چوتھی یا پانچویں صدی میں بعض عارضی عوامل سے متاثر ہو کر ہمارے فقہانے فقہی اجتہاد کے دروازے بند کر دئے ممکن ہے کہ وقت کی مصلحتوں کا یہی تقاضہ ہو اور ماحول کی اصلاح کا یہی واحد طریقہ ہو لیکن اس کے اثرات کی دور رسی اور ہمہ گیری کو غالباً یہ بزرگ پوری طرح محسوس نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی پوری ملی حرکت کا محور دین تھا۔ دین کے خارجی پہلو یا اس کے معاشرتی رخ سے اجتہاد کو خارج کر کے جمود کو دعوت دینا ایک طرح سے ان کی ملی حیات کو جامد بنا دینا تھا زندگی کے تمام شعبے جامد ہونے شروع ہو گئے علوم وفنون کی حرکتیں سست ہو گئیں اگلوں کا ضروری احترام بیجا عصبیت میں تبدیل ہو گیا غلطیاں کرسکنے والے عملاً معصوم بن گئے۔ جدت افکار گویا ناپید ہو گئی اہل علم کی دماغی ایجوں نے فکری جولانیوں کے لئے اس قید و بند میں بھی نئے میدان تلاش کرنے شروع کر دئے جو پچھلوں کے لئے شمع راہ ہونے کے بجائے رستے

کے روڑے ثابت ہوئے اس کے مختلف النوع مظاہر کی تفصیل و تفتیش کا یہ موقع نہیں تاہم اس کا تعلیمی اور تصنیفی مظہر سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ جدتِ فکر کی بے راہ روی نے نئی پگڈنڈیاں نکالیں۔ متقدمین کے استنباط کئے ہوئے مسائل جیستاں بنے جیستانوں کے حل دریافت ہوئے اور حلوں کو معمہ کیا گیا۔ اعتراض اور جواب توثیق و تردید اور توجیہ و تعلیل کی تہیں جمتی گئیں۔ اگلوں کی کلیات نے نئے استقراء اور استنباط سے پچھلوں کو بے نیاز کر دیا۔ اس تاریک فضا میں اگر کسی من چلے دماغ نے کوئی چمک محسوس کی تو معاصرین اور متاخرین کی کج بحثیوں نے اس پر دھندہ پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ زمانے کو قدامت سے بیر ہے لوگوں نے پچھلوں کی پذیرائی کی اور اگلوں کے کاموں کو کتاب خانوں میں بند کر کے طالبانِ فن سے اجتہادی نمونے بھی چھین لئے اور پچھلوں کی جامد تالیفیں ان کی رہنمائی کے لئے رہ گئیں ہمارے نصاب کی کتابوں پر نظر ڈال جائیے قریب قریب سب کتابیں مسلمانوں کے عہدِ جمود کی یادگار ہیں، متن، شرح اور حاشیے کا ایک چکر ہے جس میں نہ علم کی انفرادیت قایم ہے نہ مضمون کی جامعیت نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کس کس کا کیا کیا حصہ ہے۔ کس کس کی فروگذاشتیں ہیں اور کس کس کی اصلاحیں۔ طرزِ تحریر دیکھئے تو محض کتابی نہ زندگی سے مربوط نہ مقصد سے چسپاں خود قناعتی جمود، حقیقتوں سے اغماض اور کج بحثی تو ہمارے مدارس کی گویا خصوصیتیں ہیں۔

علوم و فنون کے جمود نے مسلمانوں کے سب سے اہم قومی ادارے تعلیم کو جامد بنا دیا اور وہ درسگاہیں جو زندگی کی نشو و نما میں سب سے زیادہ قابل قدر حصہ لیتی تھیں زندگی سے دور ہوتی چلی گئیں۔ لیکن یہ دوری بہت دنوں تک محسوس نہ ہو سکی۔ اتفاق سے مشرق میں خود زندگی بہت دنوں تک ساکن اور جامد رہی اور ہماری درسگاہیں اپنے پرانے ڈھرے پر رہتے ہوئے بھی صدیوں تک زندگی کی ہم آہنگی کرتی رہیں۔ مغرب اور مشرق کا تصادم ہوا اور مشرق میں پہلی بار زندگی نئی افکار، نئی اقدار اور نئے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوئی ہماری درسگاہیں نہ وقت کے ان نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھیں نہ ان نئی فکروں اور نئی قدروں کا مقابلہ کر سکتی تھیں چنانچہ ہماری درسگاہوں کو اپنی ہر جہتی ختم کرنی پڑی اور آہستہ آہستہ اپنے دائرے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ علوم و فنون میں دینی اور دنیوی کی تقسیم قبول کر کے اپنے

آپ کو دینی علوم کی تعلیم میں محدود کر لیا۔ اس تدبیر سے تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ زندگی سے بچتے بچتے گذر گیا۔ لیکن جس طرح زندگی سے الگ کر کے عام علوم وفنون کی تعلیم بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح خالص دینی تعلیم کو بھی زندگی سے بچا کر باقی نہیں رکھا جا سکتا چنانچہ رفتہ رفتہ وہ گوشہ عافیت بھی تنگ ہونا شروع ہو گیا جس کو ہماری درسگاہیں قلعہ بند سمجھے ہوئے تھیں۔

یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہے بھی یہی کہ ماحول اور فضا کافی مسموم ہو چکی ہے لوگوں کو دین سے وہ لگاؤ نہیں ہے جیسا ہونا چاہئے۔ اسلامی مدارس کی تعلیم و تربیت سے مجد بڑھتا جا رہا ہے دینی عقاید و تصورات میں وہ قوت باقی نہیں رہی ہے جو امتِ مسلمہ کو زندگی کے میدان میں منظم و منضبط رکھ سکے لیکن اس کی ذمہ داری صرف دوسروں پر ہی نہیں ہے کچھ قصور ہماری درسگاہوں کا بھی ہے۔ ہماری درسگاہوں نے زندگی کو ایک کل کی صورت میں دیکھنا چھوڑ دیا زمانے کی عقل کو ناقابل اعتنا قرار دیا۔ عصری علوم وفنون سے دیدہ و دانستہ اغماض کیا اور اس طرح زندگی سے کٹ گئیں، ہمارے علماء کا فرض تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے اور حقیقی علل و اسباب کو دریافت کرتے اور جب مرض متعین ہو جاتا تو صحیح علاج کی طرف متوجہ ہوتے اور طبیب حاذق کی طرح ہر وقت مرض اور علاج کی مطابقت پر نظر رکھتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ برخلاف ازیں انھوں نے محض دوسروں کی کوتاہیوں سے اپنی اور اپنے اداروں کی کمیوں کی تلافی کرنی چاہئے

مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کی انفرادیت کو قایم رکھنا ضروری ہے اور یہ بغیر اسلامی درسگاہوں کے ممکن نہیں۔ ہماری آج کی اسلامی درسگاہیں پرانے عربی کے مدرسے ہیں اور یہی ہماری اس ملی حیات کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ جس کی شیرازہ بندی مذہب کرتا ہے ان مدرسوں کے علاوہ مسلمانوں کے اور جتنے ادارے ہیں یا قومی اور وطنی زندگی کو پیش کرتے ہیں یا دوسرے عصری محرکات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب، طرزِ تعلیم، ان کے اساتذہ کا اندازِ فکر ان کے طلبہ کا اندازِ نظر، سب کے سب زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء نے یا حالات کی قوت کو محسوس نہیں کیا یا راضی بقضا ہیں۔

زندگی اپنا چولا بدل چکی۔ علوم و فنون بدل گئے۔ مسائل دوسرے ہو گئے طرزِ فکر اور اندازِ نظر بدل ہو گیا۔ ہر چیز قانونِ ارتقاء کے سخت ماضی سے بہت آگے نکل گئی دنیا کے جن جن اداروں نے زندگی کا ساتھ دیا اور اس کی ارتقاء میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے اور ترقی کرتے رہے جو ادارے زندگی کا ساتھ نہ دے سکے انھیں ختم ہونا پڑا۔ کائنات کی ترقی پذیر روحِ حیات کو جذب کئے ہوئے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری ان پرانی درسگاہوں نے بدقسمتی سے قدرت کے اس اٹل قانون کی خلاف ورزی کی اس لئے یا فنا ہو گئیں یا فنا پر آمادہ ہیں۔ ان کو ان کی موجودہ حیثیت میں باقی رکھنے کی ہر کوشش لاحاصل ہے ان کا کام ختم ہو گیا اُن میں پڑھائے جانے والے علوم فرسودہ ہو گئے۔ طریقۂ تحقیق اور طریقِ تعلیم دونوں بوسیدہ ہیں۔ نہ یہ ہماری خارجی زندگی سے ہم آہنگ اور نہ داخلی حیات سے مطابق ان میں اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں زندگی کو اسلامی اصول پر متوازن بنانے کے لئے جن قابلیتوں کی ضرورت ہے ان کو پیدا کرنے سے یہ قاصر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا باقی رہنا کرامت ہو سکتا ہے تاریخ کا تقاضا نہیں۔ اس بدلی ہوئی فضا میں ان کو باقی رکھنے کی بڑی سے بڑی کوشش ان کی رفتارِ زوال کو کچھ سست کر سکتی ہے ان میں زندگی نہیں پھونک سکتی۔

تاہم اگر ان مدارس کو پرانے انداز پر ہی باقی رکھنا ہے تو پھر وہی تدبیر کرنی ہو گی جس کو اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے آزمایا گیا تھا۔ ان مدارس کو اور زیادہ نیچے لانا پڑے گا اور کمیت کے ساتھ کیفیت کو بھی محدود کرنا ہو گا۔ نصاب کو بہت زیادہ ہلکا کرنا پڑے گا۔ تعلیمی گھنٹوں میں کافی کمی کرنی ہو گی۔ اوقات میں تبدیلی کی جائے گی اور مدت تعلیم کو کم کیا جائے گا۔ تاکہ مذہبی تعلیم کے شائق (اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں) اپنے غیر مصروف گھنٹوں میں دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ دو تین سال میں مذہبی نصاب کو ختم کر سکیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے خصوصی ذوق اور اچھی صلاحیت والے افراد نکل آئیں جو اس تعلیم کی اپنے طور پر تکمیل کر کے ہمارے موجودہ علماء کی جگہ لے سکیں۔

اس تدبیر سے ہم اپنی موجودہ درسگاہوں کو کچھ زمانے کے لئے آباد کر لیں گے اور مذہبی تعلیم

کا چرچا کچھ دنوں کے لئے مزید برقرار رہے گا کیونکہ یہ محض عارضی تدبیر ہے جو موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے شاید پیش رو تدبیر سے بھی کم دیرپا ثابت ہوگی اور ہمیں چار و ناچار ان مدارس کو مستقلاً بند کرنا پڑے گا یا پھر کوئی دوسری تدبیر کرنی ہوگی۔ کیونکہ آج کل ظروف و حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ ذہنیتوں میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب آتا جارہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی عارضی تبدیلیاں بہت زیادہ وقتی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہاں اگر ہمارا مطمح نظر "انداز اور طرز" نہیں ہیں ہم علوم اور فنون کو انھی علوم اور فنون میں منحصر نہیں سمجھتے ہیں جو متاخرین سے ہمیں ورثہ میں پہنچے ہیں بلکہ ہمارا مقصود اسلامی ادارۂ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کو وہ کیسے ہی حالات اور ظروف میں ہو اسلامی بنایا جاسکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کی جائے تو پھر اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا مدرسوں میں عصری روح جذب کرنی ہوگی قدیم فرسودہ علوم و فنون کے بجائے علوم و فنون کو ان کی ترقی یافتہ شکل میں شامل کرنا ہوگا تعلیم کو زندگی سے مربوط کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔ ان درسگاہوں کا دینی پہلو یہ ہوگا۔ . . . . . کہ طلبہ کو اسلام کی حرکی قوتوں سے آشنا کریں گی۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے زندگی میں کس طرح ضبط پیدا کیا جاسکتا ہے یہ درسگاہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کریں گی۔

غالباً صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اسلام کے تعلیمی ادارے کو باقی رکھا جاسکتا ہے اور اس کو مسلمانوں اور خود اسلام کے لئے مفید بنایا جاسکتا ہے اور تنہا اسی قسم کی درسگاہوں کے فضلا سے زندگی میں رہنمائی کی توقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ درسگاہیں زندگی سے بے گانگی نہیں برتیں گی اس لئے وہ شاید زیادہ دیرپا اور مستقل ثابت ہوں۔ یہ طریقہ ایک بار کامیاب ہو چکا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب ناکام ہو اور اگر خدانخواستہ ناکام ہوا تو بھی ممکن ہے کہ اس تجربے کی بنا پر ہم زیادہ بہتر اور زیادہ عملی راہوں کا سراغ پا سکیں لیکن اگر کچھ بھی نہ ہو سکا اور اصلاح کے شوق میں ہماری موجودہ

درسگاہیں جاتی رہیں تو یہ ایسی بات ہے جو ہونی ہے اس لئے خوف زدہ ہو کر ہمیں صحیح سمت میں کوششیں نہ چھوڑ دینی چاہئیں کیونکہ تسکین کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی جیسی کر لی۔

ہمارے مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ تحقیق کرنی ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کا وہ خاص ڈھانچہ کون سا ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی مدارس میں حد فاصل ہے کون سے مضامین لازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور کون سے اختیاری ان مدارس کی تعلیم اور تربیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ ان امور کی صحیح تحلیل کر لی جائے تو ممکن ہے کہ اصلاح کے لئے صحیح رستے مل جائیں۔

تذکروں اور تاریخوں نے ہمارے مدارس کے نصاب کے بارے میں جو کچھ محفوظ رکھا ہے اس سے اور مختلف علوم و فنون کی ان تصانیف سے جو ہم تک پہنچی ہیں یا قیاس کرنا بے جا نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے دین کو اساس بنا کر تعلیم کی عمارت کو استوار کیا اور ہر طرح کی فکری اور عملی کوششوں کو دین کے سانچے میں ڈھال دینے کی کوشش کی۔ اصل خاکے کو مذہبی رکھ کر اس میں علوم و فنون کی رنگ آمیزیاں کیں۔ مذہب کے تعرق کو نمایاں کیا۔ اس طرح اگر ایک طرف مسلمانوں کے علوم و فنون مذہب سے متاثر ہوئے تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ دوسری طرف مذہب نے بھی بعض اپنی اثر قبول کئے تاہم مسلمانوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اس ڈھانچ کو جو زمانے نے ان کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا تھا کسی طرح نہ چھوڑا۔ ہماری درسگاہوں کا یہی مخصوص ڈھانچ ہے جو ان کو دوسری درسگاہوں سے ممتاز بناتا ہے۔

مسلمانوں کے نصاب تعلیم کے صدہا سالہ مسلسل تغیروں پر اڑتی سی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات اور عربی کو چھوڑ کر ہمارے نصاب کے تمام دوسرے مضامین میں پیہم رد و بدل اور متواتر حذف و اثبات ہوتا رہا ہے اور یہ استثنا بھی ابتدائی اور متوسط نصاب میں ہے نصاب تعلیم کے اعلیٰ مراتب میں یہ استثنا بھی نظر نہیں آتا۔ تفقہ فی الدین اور عربی کی لسانی مہارت طلبہ کے ذوق، مناسبت طبع اور فرصت اور حالات کی مساعدت پر منحصر رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین سے اوسط درجے کی عام واقفیت پیدا کرانی جس سے اسلام کے

عقاید و اعمال واضح ہوجائیں، اسلامی طرزِ زندگی کا علم ہوجائے اور معاشرہ کی روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہوسکیں ہمارے مدارس کا مطمحِ نظر تھا اس سے زیادہ کی تعلیم کو ادارے نہ ضروری سمجھتے تھے اور نہ مناسب۔ ان اداروں کو عربی سے جتنی دلچسپی تھی اس کی حدیں بھی مقرر تھیں یہ درسگاہیں اپنے طلبہ کو اس قدر عربی سے لازماً آشنا بنادیتی تھیں جس سے وہ قرآن و حدیث سے بطور خود اور بلاواسطہ فائدہ اٹھا سکیں اور اسی ضمن میں فقہ و اصول اور عقاید و کلام کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کرسکیں۔ عہدِ جاہلی کی ادبی عربی اپنی تمام لسانیاتی نزاکتوں اور فصاحت و بلاغت کے نکتوں کے ساتھ قرآن کے اسلوبِ بیان، اعجاز اور تدبرِ معانی کے لئے ضروری سہی، دورِ جدید عربی اہلِ زبان کے اختلاط و تعلق کے لئے ناگزیر سہی لیکن ہماری درسگاہوں نے اپنے عام متوسط نصاب کا ان کو جزو لازم نہیں بنایا بلکہ خصوصی ذوق اور شخصی ضرورتوں پر محمول رکھا۔

اسلامی درسگاہوں کی تربیت کی امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ طلبہ میں اسلامی کردار کو نشو و نما دیں، ان کے افکار، اخلاق اور اعمال کو اسلامی نمونے کے مطابق ڈھالیں۔ چنانچہ صالح ماحول، اسلامی کردار کے اساتذہ اس تربیت کے لئے ضروری عناصر سمجھے گئے۔ غرض یہ کہ ہماری درسگاہوں کی تربیت کا مقصد صرف اچھے اور مفید شہری بنانا نہیں رہا ہے بلکہ اچھے اور مفید مسلمان بنانا رہا ہے اور تنہا یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے مسلمانوں کو اپنی مستقل درسگاہوں کی ضرورت ہے۔

اسلامی درسگاہوں کے امتیازی اوصاف کی اگر یہ تحلیل درست ہے تو ان کو سامنے رکھ کر ہی ہمیں اپنے مدارس کی اصلاح کرنی چاہئے جہاں تک تربیت اور مقصد کا تعلق ہے جب تک ہماری درسگاہوں کو ایسے اساتذہ میسر نہ آجائیں جو خود اس رنگ میں رنگے ہوں اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اپنی درسگاہوں میں مقصد اور تربیت کے اعتبار سے سو فی صدی کامیاب ہوں گے تاہم اس سلسلے میں جو کوششیں ہوسکتی ہوں ان سے دریغ نہ کرنا چاہئے اور جو وسائل مفید ہوں ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

ابتدائی اور متوسط نصاب میں دینیات اور عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اعلیٰ اور تکمیلی نصاب میں ان کو اختیاری مضامین کی حیثیت میں پڑھایا جائے اور حتی الامکان ان درسگاہوں کو ہر جہتی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پرانے علوم آج اتنے ترقی کر چکے ہیں کہ جدید و قدیم میں نام کے علاوہ شاید کوئی اشتراک نہیں۔ فہرست علوم میں سیکڑوں نئے علموں کا اضافہ ہو گیا ہماری درسگاہوں کو حسب مقدرت ان سب کو شاملِ نصاب کرنا چاہیے اور ایسے تمام علوم و فنون کو جو آج محض قدیم نظریوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ان کو عام نصاب سے خارج کیا جائے ان کی صحیح جگہ ہمارے مدارس میں اگر کہیں ہے تو تخصص کے مرحلے میں اور وہ بھی اختیاری حیثیت میں۔

یہ سچ ہے کہ ہماری عام درسگاہیں موجودہ فنون کی تعلیم کا بار اٹھانے کے قابل نہیں لیکن ابتدائی اور ثانوی مرحلوں تک بہت سے مدرسے اگر چاہیں تو جدید تعلیم کا بار اٹھا سکتے ہیں ہندوستان کے بعض بڑے مدرسے کوشش کریں تو کم از کم نظری فنون کو جامعی معیار تک بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح جب نئی منہاج کی بنیاد پڑ جائے گی اور نئے فنون ہماری درسگاہوں میں بار پالیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عملی فنون کی تعلیم کے لئے راہیں نہیں کھلیں گی اور خدا ان کے لئے اسباب مہیا نہیں کریگا میرا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم میں جذب کی ہوئی عصری تعلیم ہماری درسگاہوں کی معرفت کافی سستی اور زیادہ مفید ثابت ہوگی زبان کا مسئلہ بھی اب زیادہ دشوار نہیں ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ نے کام چلانے کے لئے اردو میں کافی مسالہ جمع کر دیا ہے جسے اگر چاہیں تو بھارت میں تنہا یہی اٹھا سکتی ہیں اور یوں حکومت سے آزاد رہ کر اردو کی ٹھوس خدمت بھی انجام دی جا سکتی ہے۔

پوری تعلیم کو ایک اکائی کی صورت میں ضبط کرنا نہ طلبہ کے لئے مفید ہے اور نہ سرپرستوں کے لئے خالص تعلیمی زاویہ نظر بھی اس طریق کار کی تائید نہیں کرتا۔ تعلیم کو چند اور مکمل بکار آمد مرحلوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ ابتدائی مرحلے کو چھوڑ کر ثانوی اور جامعی مرحلوں میں طلبہ کی ضرورتوں اور مناسبتوں کے سخت اختیاری مضامین کی مجموعہ بندیاں کرنی چاہئیں۔ تخصص اور مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں اس کے بغیر ہماری درسگاہیں ہر جہتی اور مفید نہیں بن سکتیں مضامین کی تقسیم مجموعہ

ندی اور محرکِ تعلیم میں عصری حقیقتوں اور ماہرینِ تعلیم کی رایوں اور منصوبوں سے کام لینا چاہیئے اس طرح ہم بہت سی کاوشوں سے بھی نجات پالیں گے اور ہمارا نظامِ تعلیم خود بخود حرکی اور عصری روح سے ہم آہنگ رہے گا۔

ہماری درسگاہوں کے مروجہ دینیاتی نصاب میں قرآن کو عملاً مرکزی حیثیت حاصل نہیں حالانکہ اس کو سمجھنے اور اس کا عام میلان و مزاج دریافت کرنے کا واحد ذریعہ قرآن ہی ہے۔ قرآن میں بلا واسطہ تدبر کی راہیں بڑی حد تک بند ہیں۔ آئندہ نصاب میں اس کو مرکزی مقام ملنا چاہیئے اور بلا واسطہ تدبر کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے احادیث کا دورہ حنفی فقہ اور اشعری کلام کی روشنی میں پورا کر دیا جاتا ہے اور اس طرح احادیث کی تمام دوسری حیثیتیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ احادیث کو جب تک شرح قرآن کا درجہ نہیں دیا جائے گا ان کی تعلیم کا صحیح فائدہ حاصل نہیں ہوگا فقہ آج تقلید محض ہے تعلیم کے آخری مرحلوں میں حقیقی تفقہ پیدا کرنا ہمارے نصاب کا مطمح نظر ہونا چاہیئے۔ اصولِ فقہ کا درس بالکل بے مقصد ہو گیا ہے اس کو با مقصد بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ عقاید و کلام میں مختلف اسباب و عوامل کی بناء پر عجیب و غریب عقائد اور دور از کار نظری مباحث شامل ہو گئے ہیں۔ جو ممکن ہے کبھی مفید اور ضروری ہوں مگر آج ان کی وجہ سے اسلامی عقاید کی سادگی چھپ جاتی ہے اور اس زمانے کے ذہن کے لئے طمانیت بخش ہونے کے بجائے الجھنوں کا باعث ہیں۔ دینیات کے لئے جدید نصاب پر غور کرتے وقت ان سب باتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا نصاب اسلامی روایات سے مناسبت رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید ماحول کی ضرورتوں کو بھی پورا کر سکے۔

دوسرے فنون کی تعلیم میں تاریخی پس منظر کے طور پر ان خدمتوں کو جو مسلمانوں نے انجام دی ہیں نمایاں کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی تاریخ علوم میں جو خلا ہے بھر جائے اور اس لئے بھی کہ ہماری موجودہ تعلیم اپنے ماضی کے ساتھ مربوط ہو۔ اس طرح نہ ہم اپنے اسلاف سے بیگانے رہیں گے اور نہ ہماری ملی وحدت زمانوں اور عصروں سے پارہ پارہ ہوگی۔

ہمارے مدارس میں ابتدا سے بعض ایسے مضامین درس میں شامل ہیں جو ابتدائی موقف میں بالکل

بے کار ہیں اور ان میں طلبہ کی قوت بے جا صرف ہوتی ہے ایسے مضامین کو ابتدائی مراحل سے خارج کردینا بہتر ہے۔ ان کا درس بشرط ضرورت صحیح موقعوں پر ہونا چاہئے۔ معانی، بیان، اصول فقہ، منطق اور فلسفہ اسی قسم کے مضامین ہیں بصرف دنحو ابتدائی مرحلے کے لازم مضامین ہیں مگر ان کی مجرد حیثیت میں تعلیم طلبہ پر غیر ضروری بار ہے۔ ان کی تعلیم زبان کے ضمن میں ہونی چاہئے یوں طلبہ دلچسپی بھی محسوس کریں گے اور زبان کے ساتھ قواعد کی مشق بھی ہو جائے گی۔

زیرِ درس مضامین میں اصل اہمیت علوم کو دینی چاہئے نہ کہ کتابوں کو۔ کتابوں کی حیثیت ان یاد داشتوں سے زیادہ نہیں جن میں اساتذہ اور طلبہ کی سہولت کے لئے متعین معیاروں کے تحت علمی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بغیر خاص ضرورت کے کتاب کو موضوعِ درس بنانا تعلیم کو ناقص بنانے کے مترادف ہے۔

تعلیم میں اس کی خاص طور پر نگرانی کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا موضوع طالب علم رہے، تعلیم میں اس کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مناسبتوں کا خیال رکھا جائے، اس کی ذہنی الجھنوں اور کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان کو حل کرنے اور دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے تعلیم کا فائدہ طالب علم کے انفرادی اور اجتماعی رجحانوں کو سدھار کر اس کو سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور بکار آمد بنانا ہے نہ کہ اس کو علوم کی کال کوٹھری بنانا اسی ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ میں تعمیری نقد کی حوصلہ افزائی کی جائے اس طرح نہ صرف یہ کہ اس کی تخریبی قوتوں کی اصلاح ہوگی بلکہ اس کی داخلی الجھنوں کی بھی تسکین ہوتی رہے گی اور دماغی اوج میں ترقی بھی۔

اس سلسلے کی آخری گذارش مدارس کے اربابِ انتظام سے یہ کرنی ہے کہ اگر ہندستان کے فکرِ تعلیم کے منظور کئے ہوئے مراحل اور ان کے بنائے ہوئے نصابوں کو معیار بنا کر ضروری حذف و اثبات سے ان میں دینیات کو جذب کر دیا جائے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ یہ کچھ زیادہ دشوار نہیں تو بہت سی کاوشوں سے نجات مل جائے گی اور ہمارا نصاب خود بخود زمانے کے ساتھ چلنے لگے گا، اساتذہ کا مناسب انتخاب، تعلیم اور طرزِ تعلیم کی نگرانی طلبہ میں اسلامی روح پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

م م

ابتدائی مراحل میں اساتذہ کی تھوڑی سی توجہ سے عربی اور دینیات کو ایک دوسرے میں جذب کیا جاسکتا ہے ابتدائی مراحل میں عربی کو لازم کرنے کا مقصد طلبہ کو ابتدا سے ہی ایسا ذریعہ فراہم کردینا ہے جسے وہ دینیات کے ماخذوں سے براہ راست اور بقدر استعداد فائدہ اٹھاسکیں۔ اگر قرآن حدیث اور فقہ وعقاید سے الفاظ فقروں، جملوں اور عبارتوں کا انتخاب کرکے عربی کی تعلیم دی جائے تو یہ فائدہ بدرجۂ اتم حاصل ہوجائے گا اور زبان کے اعتبار سے بھی عربی اتنی ہوجائے گی کہ آئندہ مراحل میں ادبی عربی کے لئے درجات کا کام دے۔

آخر میں مجھے ایسے تمام بزرگوں اور رفیقوں سے جن کو میری مفروضات سے دکھ پہنچا ہو یا انھوں نے سوء ادب محسوس کیا ہو معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ میری نیت نہ دکھ دینا ہے اور نہ سوء ادب کا ارتکاب "ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ"

تفسیر مظہری

(تمام عربی مدرسوں کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کے لئے بیمثل تحفہ)

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہر نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمدللہ۔ سالہا سال کی عرقریزکوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہوجانے کا اعلان کرسکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہوچکی ہیں جو کاغذ اور دیگر سامان طباعت وکتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں۔ آخری جلد زیر کتابت ہے

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۲×۲۹/۸ سات روپے، جلد ثانی سات روپے، جلد ثالث آٹھ روپے، رابع پانچ روپے، خامس سات روپے سادس آٹھ روپے، سابع آٹھ روپے، ثامن آٹھ روپے

۴۵